بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

پچھلے مہینے ان صفحات میں ہندوستان کے تازہ سیاسی انقلاب کا جو جائزہ لیا گیا تھا وہ اس کے صرف ایک پہلو سے تعلق رکھتا تھا۔ اس میں ہم نے بحیثیت مجموعی پورے ملک کی حالیہ سرگزشتِ خونیں پر ایک نگاہ ڈال کر یہ بتایا تھا کہ اس ملک کے سابق حکمرانوں اور سیاسی لیڈروں نے مل جل کر اپنی خودغرضی، تنگ دلی اور احمقانہ بے تدبیری سے اس کو کس خوفناک تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے، اور اس سے بچنے کی واحد صورت اب کیا ہے۔ آج ہم اس کے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ اس انقلاب میں سب سے زیادہ تباہی جس قوم پر آئی ہے — یعنی مسلم قوم —— وہ آج کس حال میں ہے، کن اسباب نے اسے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، اور اب کیا چیز اسے بچا سکتی ہے۔

دس گیارہ برس پہلے کی بات ہے جب ہندوستان کے سات صوبوں میں یکایک کانگریس کو برسرِ اقتدار دیکھ کر اور پنڈت نہرو سے مسلم عوام کے ساتھ براہ راست ربط قائم کرنے کا پروگرام سن کر مسلمانوں کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ اس ملک میں ہندو قوم پرستی کا غلبہ اُن کے لئے ایک حقیقی خطرہ ہے اور یہ خطرہ سر پر آچکا ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ موجود تھے۔ ایک گروہ کہتا تھا کہ خطرہ وطرہ کچھ نہیں ہے، سب تمہارا وہم اور انگریز کا دلایا ہوا ڈراوا ہے، جو سیلاب

اُٹھ رہا ہے ٹھیک اُٹھ رہا ہے: اطمینان کے ساتھ اس میں کود پڑو، اور جدھر وہ بہا کر لے جانا چاہتا ہے پورے انشراحِ صدر کے ساتھ ادھر بہہ جاؤ۔ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ خطرہ واقعی اور حقیقی ہے، یہ سیلاب محض آزادیٔ وطن کا سیلاب نہیں بلکہ ہندو امپیریلزم کا سیلاب ہے، اپنے آپ کو اس کے حوالہ کر دینے کے معنی قومی خودکشی کے ہیں، اور اس سے بچنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔ پہلا گروہ اگرچہ بڑی بڑی مذہبی شخصیتوں اور آزمودہ کار سیاسی لیڈروں پر مشتمل تھا لیکن چونکہ وہ ایسی بات کہہ رہا تھا جو مسلمانوں کے عام احساسات کے خلاف تھی، اور پوری قوم کو ہندوستان کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم پرستی کے ہاتھوں اس کے بالکل برعکس تجربات پیش آ رہے تھے، اس لئے مسلمانوں نے مجموعی طور پر اس کو رد کر دیا۔ اور جوق در جوق دوسرے گروہ کی آواز پر وہ لبیک کہتے چلے گئے۔

پھر دوسرے گروہ میں بھی جلدی ہی اس مسئلے پر اختلاف رائے ہو گیا کہ ہندو امپیریلزم کی اس بڑھتی ہوئی رو کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے راہ عمل کیا ہے۔

ایک رائے یہ تھی کہ مغربی جمہوریت اور قوم پرستی کے اصولوں پر ہندو اقتدار کی تحریک کا مقابلہ کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مفید نہیں۔ اصولاً اس لئے غلط ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ اصول اُن اسلامی اصولوں سے ٹکراتے ہیں جن پر ہم ایمان لانے کے مدعی ہیں۔ اور عملاً یہ راہ اس بنا پر غیر مفید ہی نہیں، قطعی مہلک ہے کہ ہندوستان کے ایک چھوٹے سے حصے کو چھوڑ کر باقی سارے ملک میں مسلمان قلیل التعداد ہیں، اور ایک جمہوری نظام میں قومی جنگ لڑ کر اقلیت بجز تباہی کے اور کچھ مول نہیں لے سکتی۔ اس رائے کے پیش کرنے والوں نے مسلمانوں سے کہا کہ اگر تم محض ایک قوم ہوتے تو بلاشبہ تمہارے لئے یہاں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ قومی جنگ لڑ کر اپنے جتنے حصے کو بچا سکتے بچا لیتے اور باقی حصوں کی طرف سے بہ تنگی فاتحہ پڑھ لیتے۔ لیکن تم محض عام معنی میں ایک قوم نہیں ہو بلکہ ایک اصولی جماعت ہو جس کے پاس اصول اسلام کا

ہتھیار وہ زبردست ہتھیار ہے جو پہلے بھی دنیا کو مسخر کر چکا ہے اور آج بھی کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم یہ مایوسانہ نقشۂ جنگ بناؤ۔ تمہارے لئے صحیح راہِ عمل یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی اغراض کے لیے لڑنے والی ایک قلیل التعداد قوم کی یہ پوزیشن چھوڑ دو جو غلطی سے تم نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کے بجائے اپنا اصل منصب سنبھالو جو مسائلِ زندگی کا ایک بہترین حل اور تمام موجود الوقت نظاموں سے زیادہ جامع اور منصفانہ نظام پیش کرنے والی جماعت کا منصب ہے۔ اس چیز کو لے کر اگر تم اُٹھ کھڑے ہوئے اور تم نے علمی و فکری حیثیت سے اصولِ اسلام کا تفوق تمام دوسرے اصولوں پر ثابت کر دیا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے ہمسایوں پر فائق کر کے دکھا دیا تو یقین جانو کہ تھوڑی ہی مدت کے اندر ہندوستان میں توازنِ قوت بدل جائیگا۔ ہندوستان کی سیادت تمہارے سوا پھر کسی اور کا حصہ نہ ہوگی، اور بجائے اس کے کہ تم اپنے بچاؤ کے لئے پریشان ہو تمہارے حریفوں کو یہ فکر لاحق ہو جائیگی کہ وہ تمہارے بڑھتے ہوئے سیلاب سے اپنے آپ کو کس طرح بچائیں۔

یہ وہی بات تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں قریش کے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ کلمہ لیکر آیا ہوں کہ اگر تم اسے لے لو تو عرب اور عجم سب تمہارے زیرِ نگیں ہو جائینگے۔ لیکن مسلمانوں نے اس مشورے میں وہی خطرہ محسوس کیا جو قریش نے محسوس کیا تھا کہ اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا، یعنی اگر ہم اس راہِ عمل کو اختیار کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا کوئی ٹھکانا نہ رہیگا۔ پوری قوم میں بہت کم لوگ اس راہ کے امکانات کو سمجھ سکے، اور بہت ہی کم لوگ اس پر چلنے کے لئے آمادہ ہوئے۔ اس طرح یہ رائے قومی طرزِ عمل نہ بن سکی۔

دوسری رائے یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں اور مل کر آواز اُٹھائیں کہ ہم ایک الگ قوم ہیں، ہمارا مذہب الگ ہے، ہماری تہذیب الگ ہے، ہمیں اور ہندوؤں کو ملا کر سارے ملک میں ایک قومی جمہوری ریاست بنا دینا صحیح نہیں ہے،

ملک کو تقسیم کیا جائے، جہاں ہماری اکثریت ہے وہاں ہماری آزاد قومی حکومت بنے اور جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے وہاں ان کی آزاد قومی حکومت بن جائے۔

یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں نہ کسی ذہنی کاوش کی کوئی حاجت تھی اور نہ کسی اخلاقی اصلاح وانضباط کا کوئی سوال۔ بظاہر بات بھی بالکل صاف تھی، اور مسلمانوں کے ذہین طبقہ کو ایک مدت سے جس قسم کی تعلیم و تربیت مل رہی تھی، اس کے لحاظ سے یہی بات ان کی دماغی سطح سے قریب تر بھی تھی، اس لئے مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس رائے کو اپنا لیا۔ اس مرکزی تخیل پر جمع ہونے کے بعد سے جو کچھ مسلمانوں نے من حیث القوم کیا ہے اُس تحریک اور اس قیادت کے زیر اثر کیا ہے جو اس تخیل کو پیش کرنے کی ذمہ دار تھی، لہٰذا ہماری ماضی قریب کی سرگزشت کا اور ہمارے آج کے حال کا حُسن و قبح لازماً اس تحریک ہی کی طرف راجع ہوگا۔

یہ تحریک ایک قومی تحریک تھی۔ اس میں وہ سب لوگ شریک ہوئے جو نام و نسب کے لحاظ سے مسلم قوم کے افراد تھے۔ یہ سوال اس میں سرے سے بے محل تھا کہ جو اس میں شامل ہوتا ہے وہ خدا، رسول، آخرت، وحی و کتاب اور دین و شریعت کو مانتا ہے یا نہیں، حرام و حلال کی تمیز کا قائل ہے یا نہیں اور فجور و تقویٰ، دینداری و بے دینی کی مختلف صفات میں سے کس صفت کے ساتھ متصف ہے۔ اصل مسئلہ قوم کو بچانے کا تھا اور اس کے لئے تمام قومی عناصر کا متحدہ محاذ بننا ضروری تھا۔ پھر جو کام پیش نظر تھا وہ بھی فتوے اور امامت کا نہ تھا کہ دین و اعتقاد کے تجسّس کی ضرورت پیش آتی۔ مقصود صرف قومی مدافعت تھی اور اس کے لئے تحریک کی شرکت تو درکنار اس کی قیادت و رہنمائی کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنے کی حاجت نہ تھی کہ جن لوگوں کو ہم آگے لارہے ہیں ان کا اسلام سے کتنا اور کیسا تعلق ہے۔

یہ تحریک سیاسی تھی۔ اس میں اخلاق کا بھی کوئی سوال نہ تھا۔ جس نے سیاسی جوڑ توڑ میں جتنی

زیادہ مہارت دکھائی وہ اتنے ہی زیادہ ذمہ داری کے منصب کا اہل قرار پایا۔ اس قابلیت کا ثبوت مل جانے کے بعد یہ دیکھنا بالکل غیر ضروری تھا کہ اس کی دیانت، امانت، صداقت کا کیا حال ہے اور اس کی سیرت کہاں تک اعتماد کے لائق ہے۔

اس تحریک میں اگرچہ مذہب کا کوئی دخل نہ تھا، بعینہٖ اسی قسم کی تحریک ایسے ہی کارکنوں اور لیڈروں اور پیروؤں کے ساتھ دنیا کی ہر قوم اٹھا سکتی تھی، لیکن اتفاق کی بات تھی کہ جو قوم اپنی مدافعت کے لئے یہ تحریک لے کر اٹھی تھی اس کا مذہب اسلام تھا، اس لئے اسلام کی خدمات بھی اس کے لئے حاصل کی گئیں۔ اصول یہ قرار پایا کہ ہدایت و رہنمائی تو اسلام کے بس کا روگ نہیں ہے، اور نہ یہ کہنے کا اسے حق ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہ کرنا چاہیئے، البتہ یہ اس کا فرض اور اولین فرض ہے کہ جو کچھ ہم کریں وہ اس کی تصدیق و توثیق کرے، اس پر اجر کی امید دلائے، اس پر چسپاں کرنے کے لئے اپنی کوئی نہ کوئی اصطلاح مستعار دے، اور اس میں ہمارا ساتھ نہ دینے والوں کو جہنم کا راستہ دکھائے، اس لئے کہ ہم جو کچھ کریں گے اسی پر قوم کا بچنا موقوف ہے، اور قوم ہی نہ رہی تو یہ اسلام صاحب آخر رہینگے کہاں! یوں اس تحریک میں اسلام سے وہ خدمت لی گئی جو بگڑے ہوئے نواب زادے اپنے خاندان کے کسی پرانے جاں نثار ملازم سے لیا کرتے ہیں۔ مشورہ اور نصیحت اس کا کام نہیں ہوتا۔ میاں لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں۔ مگر آڑے وقت میں بوڑھے خادم کو پکارا جاتا ہے کہ آؤ اور حق نمک ادا کرو۔ پھر اگر وہ غریب اُن حرکات پر صبر نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے بُرے وقت آتے ہیں اور بے چین ہو کر کبھی کہہ بیٹھتا ہے کہ صاحب زادے اپنے اطوار ٹھیک کرو، تو اسے ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ ایا نہ قدر خود بشناس، تو اپنے کام سے کام رکھ، تیری یہ حیثیت کب سے ہو گئی کہ ہمارے معاملات میں دخل دے۔

یہ تھیں وہ بنیادیں جن پر ہماری یہ قومی تحریک اول روز سے اٹھی اور آخر تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کے اجزاء ترکیبی میں مومن اور منافق اور کھلے کھلے ملحد سب شامل تھے۔ بلکہ دین میں جو جتنا بلکا تھا

وہ اتنا ہی اوپر آیا۔ اس میں اخلاق کی سرے سے کوئی پوچھ نہ تھی۔ عام کارکنوں سے لے کر بڑے سے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابل اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے، بلکہ تحریک کا قدم جتنا آگے بڑھا اس قسم کے عناصر کا تناسب بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس میں اسلام کو اتباع کے لئے نہیں بلکہ صرف عوام میں مذہبی جوش پیدا کرنے کے لئے فریق جنگ بنایا گیا تھا۔ کبھی ایک دن کے لئے بھی اس کو یہ حیثیت نہیں دی گئی کہ وہ حکم دے اور یہ اسے مانیں، اور کوئی قدم اٹھاتے وقت یہ اس سے استصواب کریں۔

پھر چونکہ مقابلہ ہندو سے تھا اس لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے ہر حربے کا جواب ویسے ہی حربے سے، ہر چوٹ کا جواب ویسی ہی چوٹ سے، اور ہر چال کا جواب ویسی ہی چال سے دیا جائے۔ جن جن پستیوں میں وہ گرا مسلمان بھی اس کی ضد میں گرے، اور جو کچھ وہ اپنی قومی خودغرضیوں کی خاطر کرتا گیا، مسلمانوں نے اس دلیل پر کہ اس کا ارتکاب کیا کہ ہندو ایسا کر رہا ہے۔ اس مقابلہ و مسابقت نے مسلمانوں کی عام اخلاقی سطح اتنی گرا دی کہ شاید اس سے پہلے وہ کبھی اخلاقی حیثیت سے اتنے نہ گرے تھے۔

یہ تو تھا ہماری اس عظیم الشان قومی تحریک کا اخلاقی و دینی پس منظر۔ اب ذرا اس کے اصل کام کا جائزہ لیجئے جو وہ قوم کو بچانے کے لئے کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا قومی مطالبہ جو اس نے مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عددی اکثریت کے لحاظ سے ملک تقسیم کر دیا جائے۔ اس مطالبہ کے اندر آپ سے آپ تین باتیں شامل تھیں۔ ایک یہ کہ تقریباً آدھے مسلمان ہندوؤں کے قومی غلام بن کر رہ جائیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی قومی ریاست دو ایسے چھوٹے چھوٹے خطوں میں بنے جن کی حیثیت ہندو ریاست کی سرحدوں پر قریب قریب وہی ہو جو پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ جیسی ریاستوں کی حیثیت روس کی سرحدوں

پر ہے ۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں خطوں کے درمیان بھی ایک ہزار میل کا ہندو علاقہ حائل ہو اور ان کے درمیان نہ حالت امن میں پوری طرح تعاون ہو سکے نہ حالت جنگ میں یہ ایک دوسرے کی مدد کر سکیں ۔

اول روز ہی سے معلوم تھا کہ ہندو اس مطالبہ کی سخت مزاحمت کریگا، چنانچہ اس نے کی اور ایک طرف سے مطالبے اور دوسری طرف سے مزاحمت نے قومی جنگ کو اتنی شدید تلخی کی حد تک پہنچا دیا کہ شاید آج جرمنی اور روس، امریکہ اور جاپان، عرب اور یہود کے درمیان بھی اس سے زیادہ تلخی نہ ہوگی ۔ اس قومی جنگ میں لامحالہ مسلمان ہی سب سے زیادہ نقصان اُٹھانے والے تھے ۔ کیونکہ ان کا پورا نصف حصہ ہمارے اپنے مطالبہ کی رو سے ان کے مالکانہ تصرف میں جانے والا تھا ۔ پھر چونکہ اقلیت کے مسلمانوں کو بھی اس جنگ میں شریک کیا گیا تھا، بلکہ پیش پیش وہی تھے، اس لئے یہ یقینی بات تھی کہ جنگ کے آخری مرحلوں میں، اور تقسیم کے بعد ان کو بدترین مظالم کا تختۂ مشق بننا پڑیگا ۔ یو پی، بہار اور دوسرے ہندوستانی علاقوں میں کسی مکان پر "پاکستان زندہ باد" لکھا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ایک وقت میں یہی فقرے بدمست دشمنوں کو آتش زنی، قتل و غارت اور عصمت دری کی دعوت دیں ۔

اس کے ساتھ مزید غضب یہ کہ قومی جنگ کے لئے ہم نے جو طاقت فراہم کی تھی وہ نعرے، جھنڈے، جلسے، جلوس، ریزولیوشن، اخباری بیانات اور سیاسی گفت و شنید سے زیادہ کچھ نہ تھی ۔ یہ سب ہتھیار صرف اسی حالت کے لئے موزوں ہو سکتے تھے جبکہ قسمتوں کی میزان ایک تیسری طاقت کے ہاتھ میں ہو، اور وہ خود اپنی مصلحتوں کی خاطر توازن قائم کرنے کے لئے ایک فریق کے مقابلہ میں دوسرے فریق کے شور و غل کو وزن دینا چاہے ۔ ہمارے لیڈر مدتوں تک اس حالت میں رہتے رہتے اس کے اتنے خوگر ہو چکے تھے وہ سب کچھ اسی کے اندر سوچ سکتے تھے ۔ اس کے گذر جانے کے بعد دوسری حالت میں کیا کچھ درکار ہے، اس کا شاید انھیں کوئی اندازہ ہی نہ تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے حالات یکایک پیش آگئے تو ان کا مقابلہ

کرنے کے لئے وہ بالکل بے سروسامان تھے۔

پچھلے سال کے آغاز تک کسی کو بھی محسوس نہ ہوا کہ ہم اپنے اندر کیا کمزوریاں لئے ہوئے ہیں، ہماری سیاست کیا نتائج اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، اور قومی جنگ کس رُخ پر جارہی ہے۔ شور وشغب اور ہنگامۂ جوش نے ایک ایسا فریبِ قوت پیدا کردیا تھا کہ ہم اپنی تنظیم کو ایک مکمل تنظیم اور اپنی سیاست کو ایک ماہرانہ سیاست سمجھے بیٹھے تھے، اور اس وقت ہر وہ شخص ہمیں اپنا دشمن نظر آرہا تھا جو سطح کے نیچے چھپے ہوئے کمزور پہلوؤں کی طرف، یا سر پر آئے ہوئے طوفان بلا کی طرف ذرا سا اشارہ بھی کردے۔ مگر جونہی کہ تقسیم کا فیصلہ ہوا، یکایک وہ ساری ہی کمزوریاں رنگ لے آئیں جو ہمارے قومی اخلاق میں، ہماری قومی تنظیم میں اور ہمارے سیاسی نقشے میں موجود تھیں۔

پانچ کروڑ مسلمانوں نے انتہائی بے بسی کی حالت میں ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے اپنے آپ کو اچانک اُن ہندوؤں اور سکھوں کے چنگل میں پایا جن کے ساتھ وہ چند روز پہلے دو بدو لڑرہے تھے۔ اس طرح جو تحریک پوری قوم کو بچانے کے لئے اٹھی تھی اس کی تدبیر مدافعت کا خلاصہ یہ نکلا کہ ایک نصف کو بچانے کے لئے دوسرے نصف کو ایسی سخت تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا گیا جس کا تصور بھی پہلے نہ کیا جاسکتا تھا۔

مشرقی پنجاب، دہلی اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں پر ظلم وستم کا پہاڑ یکایک ٹوٹ پڑا تو وہ قومی تنظیم جس پر کئی سال سے مسلمان اعتماد کئے ہوئے تھے ان کیلئے بالکل بیکار ثابت ہوئی۔ ہر جگہ کے مقامی لیڈروں اور قومی کارکنوں میں سے ۹۵ فیصدی سخت ناقابلِ اعتماد نکلے۔ انھوں نے عین وقت پر اپنی قوم کا ساتھ چھوڑدیا اور صرف اپنے بچاؤ کی فکر کی۔ ان محافظینِ قوم نے وہ اسلحہ تک جو مسلمانوں کی مدافعت کے لئے فراہم کئے گئے تھے، زیادہ داموں پر ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں فروخت کرنے میں تامل نہ کیا۔ انہوں نے خطرے کے علاقوں سے مسلمانوں کو بچاکر نکالنے کے بجائے اپنے جانوروں اور اپنے عیش کے سامانوں کو نکال لانا زیادہ ضروری سمجھا۔

انہوں نے پاکستان کے سرکاری ٹرکوں پر پناہ گزینوں کو بٹھانے کے لئے بھی رشوتیں وصول کیں۔ انہوں نے کیمپوں میں ایک ایک دانے کے لئے ترسنے والے پناہ گزینوں کے ہاتھ بھی وہ روٹیاں مہنگے داموں بیچیں جو سرکاری خرچ پر بھیجی گئی تھیں۔

پھر مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تعمیر سے جو غفلت برتی گئی تھی اس نے اپنے بدترین نتائج پاکستان کی سرحد کے دونوں طرف دکھائے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں نے بڑے بڑے علاقے محض دھمکیوں میں خالی کردئے، انہوں نے انتہائی بے غیرتی کے منظر جیتے جی اپنی آنکھوں سے دیکھے، ایک ایک سکھ کے آگے پچاس پچاس مسلمان زمین بوس ہوئے، اور اس کے ساتھ عین اس قیامت صغریٰ کی حالت میں بھی مسلمان نے مسلمان کو لوٹنے میں، اور ذرا ذراسی ضرورت کی چیزیں اپنے مصیبت کے ساتھیوں کے ہاتھ بلیک مارکیٹ کے داموں بیچنے میں کوئی شرم محسوس نہ کی۔ دوسری طرف مغربی پنجاب، سرحد اور سندھ کے مسلمانوں نے، ان کے لیڈروں اور قومی کارکنوں نے، ان کے منتخب کئے ہوئے ایم ایل اے صاحبان نے اور ان سرکاری ملازموں نے جو کبھی قومی درد سے بہت تڑپا کرتے تھے، ہندوؤں اور سکھوں کے مال لوٹ لوٹ کر جس طرح اپنے گھر بھرے، اپنے پناہ گزیں بھائیوں کے بسنے میں جو مشکلات پیدا کیں، مصیبت کے مارے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جس بیدردی کا سلوک کیا، اور پاکستان بنتے ہی بے نظمی، نا فرض شناسی، رشوت، خیانت، اقرباپروری اور ظلم و بے انصافی کی جو گرم بازاری کی اسے دیکھ کر یہ بالکل عیاں ہوگیا کہ سیرت و اخلاق کے بغیر نرے جھنڈوں، نعروں اور جلوسوں کے بل پر کسی قوم کو اٹھانے کے کیا نتائج ہوا کرتے ہیں۔

اس سارے نامۂ اعمال میں اگر کسی چیز کو نفع کے خانہ میں رکھا جاسکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ انہوں نے کم از کم آدھے مسلمانوں کو تو بچا لیا اور ان کی ایک قلمی ریاست بنوادی لیکن افسوس کہ اس "روشن" کارنامے کو بھی ہم بدترین غلطیوں سے داغدار پاتے ہیں اور بری طرح ان کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم ہند کا معاملہ جس طریقے سے طے کیا گیا وہ غلطیوں بلکہ حماقتوں کا ایک

مجموعہ تھا۔ سرحدات کا تعین گفت وشنید سے طے کرنے کے بجائے دوکمیشنوں پر چھوڑ دیا گیا، کمیشن کی ترکیب ایسی قبول کی گئی جس سے فیصلہ کا اختیار کلیتہً صدر کے ہاتھ میں رہ جاتا تھا، صدر بھی کسی غیر جانبدار قوم کا آدمی نہیں بنایا گیا بلکہ انگریز قوم سے لیا گیا جو ہندوستان میں نہ غیر جانبدار تھی نہ بے غرض، پھر اس فیصلہ کا اعلان کرنے کے اختیارات بھی اس شخص کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے جو صرف ہندوستان کا گورنر جنرل رہ جانے والا تھا، اور ہماری قیادت عظمٰی نے پیشگی یہ قول دے دیا کہ اس فیصلے کی رو سے جو سرحدیں مقرر کی جائینگی انہیں وہ بے چون وچرا مان لیگی۔ اس شدید غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال اور پنجاب دونوں میں مسلمان اکثریت کے متعدد علاقے ہندوستان کے ساتھ ملحق کر دیئے گئے، مشرقی پنجاب کی پوری نو تحصیلیں، جن میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی، ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں چلی گئیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ گورداسپور کا ضلع ہندوستان میں شامل ہو گیا جس کی وجہ سے کشمیر کے ہندو رئیس کو ہندوستان کے ساتھ تعلق جوڑنے کا راستہ مل گیا۔

انتقالِ اختیارات کی جو صورت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز کی تھی وہ صریح طور پر پاکستان کے حق میں سخت مضر تھی، مگر ہماری قیادت عظمٰی نے اسے بھی جوں کا توں قبول کر لیا۔ پاکستان کے حصہ کی فوجیں جگہ جگہ منتشر تھیں، اس کے حصے کا سامان اور فوجی ذخائر بھی ہندوستان کے قبضے میں تھے، اس کے حصے کا سرمایہ بھی ہندوستان ہی کے ہاتھ میں تھا، اس کے دفاتر اور اس کا عملہ تک ابھی پوری طرح منتقل نہ ہوا تھا، اور اس حالت میں پاکستان کی مستقل مملکت نظم ونسق اور دفاع کی پوری ذمہ داری کے ساتھ قائم کر دی گئی۔ آج یہ اسی حماقت کا نتیجہ ہے کہ اپنی قوم کے جس آدھے حصے کو انھوں نے ہندو اقتدار کے چنگل سے نکالا ہے وہ بھی اس کے دباؤ سے پوری طرح آزاد نہیں ہو سکا۔ جوناگڈھ پر انہوں نے زبردستی قبضہ کیا اور ہم اپنی بے بسی کی وجہ سے انگلی تک نہ ہلا سکے۔ کشمیر کے مسلمانوں کو وہ ہمارے سامنے پامال کر رہے ہیں اور ہم ان کے مقابلہ میں کھل کر لڑنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ ہماری گنّی ان سے دبی ہوئی ہے اور ہم ہر موقع پر ان سے دبتے چلے جا رہے ہیں۔

آج ایک سال کے بعد کہا جا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زبردستی سے کیا تھا اور ہم اس پر راضی نہ تھے۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب یہ زیادتی کی جا رہی تھی اور آپ دیکھ رہے تھے کہ ماؤنٹ بیٹن ہماری

بربادی کے کیا سامان کر رہا ہے، اس وقت آپ کی زبان کہاں چلی گئی تھی؟ کیوں نہیں آپ نے اپنی قوم کو اور ساری دنیا کو اس شرارت کی اطلاع دی؟ کیوں آپ خاموشی کے ساتھ وہ سب کچھ قبول کرتے گئے جو مسلمانوں کیلئے سخت تباہ کن تھا؟ کیوں آپ نے اسی وقت یہ اعلان نہ کیا کہ یہ سب کچھ ماونٹ بیٹن اپنی ذمہ داری پر کر رہا ہے اور ہم برضا و رغبت اس کی ذمہ داری میں شریک نہیں ہیں؟ صرف یہی نہیں کہ اُس وقت آپ خاموش رہے۔ بعد میں جب اس غلط طرز تقسیم کے سخت ہولناک نتائج رونما ہوگئے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا بدترین خمیازہ بھگتنا پڑا، اس وقت بھی آپ نے اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔

جیسا کہ ہم ابتدا میں کہہ چکے ہیں، دس سال پہلے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال آیا تھا کہ وہ ہندو امپیریلزم کے تسلط سے اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ اس سوال کا ایک حل تو پیش کیا گیا تھا کہ اسلام کے اصولوں اور اسلامی سیرت کی طاقت سے اس خطرے کا مقابلہ کیا جائے۔ مگر اس حل نے مسلمانوں کو اپیل نہ کیا اور وہ اسے آزمانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اب یہ بحث بیکار ہے کہ اسے آزمایا جاتا تو کیا ہوتا۔ دوسرا حل جو پیش کیا گیا وہ یہ تھا کہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی جنگ لڑی جائے۔ اسی حل کو مسلمانوں نے قبول کیا اور اپنی ساری قومی طاقت، اپنے تمام ذرائع اور اپنے جملہ معاملات اس قیادت کے حوالہ کر دیئے جو ان کے قومی مسئلے کو اس طرح حل کرنا چاہتی تھی۔ دس برس کے بعد آج اس کا پورا کارنامہ ہمارے سامنے ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے کس طرح کس صورت میں ہمارے مسئلے کو حل کیا۔ جو کچھ ہو چکا ہے وہ تو امٹ ہے، اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اس پر اس حیثیت سے تو بحث بیکار ہے کہ یہ نہ کیا جاتا تو کیا ہوتا۔ البتہ اس حیثیت سے اس پر بحث کرنا ضروری ہے کہ جو مسائل اب ہمیں درپیش ہیں، کیا ان کے حل کے لئے بھی وہی قیادت موزوں ہے جو اس سے پہلے ہمارے قومی مسئلے کو اس طرح حل کر چکی ہے؟ کیا اس کا اب تک کا کارنامہ یہی سفارش کرتا ہے کہ اب جو بڑے بڑے اور نازک مسائل ہمارے سر پر آ پڑے ہیں، جن کا بیشتر حصہ خود اسی قیادت کی کارفرمائیوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، انہیں حل کرنے کے لئے ہم اس پر اعتماد کریں؟